احمد فراز
نایافت

احمد فراز

(ف)

نام کتاب :-	نایافت
تخلیق :-	احمد فراز
قیمت :-	15/ روپے
طبع اوّل :-	جنوری ۱۹۸۸ء
ناشر :-	شالیمار پبلشنگ ہاؤس ۲۶۲۲ کوچہ چیلان، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
مطبوعہ :-	ایرینہ آرٹ پرنٹرس دہلی ۶

انتساب

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

نام کتاب :- نایافت

تخلیق :- احمد فراز

قیمت :- 15/ روپے

طبع اوّل :- جنوری ۱۹۸۸ء

ناشر :- شالیمار پبلشنگ ہاؤس
۲۶۲۲ کوچہ چیلان، دریاگنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مطبوعہ :- ایرانین آرٹ پرنٹرس دہلی ۶

انتساب

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

"گفت آں کہ یافت می نہ شود آنم آرزوست"

ترتیب

کردار

نظر بجھی تو کرشمے بھی روز و شب کے گئے

روزنامچہ من نژاد

بدن میں آگ ہے چہرہ گلاب جیسا ہے

فضانورد بادل

کہا تھا کس نے تجھے آبرو گنوانے جا

نہ اب جواز نہ موقع ہے ہاتھ ملنے کا

فصلِ رائیگاں

سلامتی کونسل

نوحہ گر چپ ہیں

گذرا ہوں جس طرف سے بھی پتھر لگے مجھے

میرے قلم پہ رہی نوک جس کے خنجر کی

قاتل

نہیں ہے یوں

مزاج ہم سے زیادہ جدا نہ تھا اس کا

چلو اسی سے کہیں دل کا حال جو بھی ہو

گلشن بی بی

تڑپ اٹھوں بھی تو ظالم تری دہائی نہ دوں

خواب جھوٹے خواب

آئینہ

درد کی راہیں نہیں آساں ذرا آہستہ چل

گلہ نہ کر دلِ ویراں کی ناسپاسی کا

نذرِ نذرل

لہولہان مسیحا

صحرا تو بوند کو بھی ترستا دکھائی دے

یہ دل کا چور کہ اس کی ضرورتیں تھیں بہت

چلو اس بُت کو بھی رولیں

سائے کی طرح نہ خود سے بھی رم کر

دولتِ درد کو دنیا سے چھپا کر رکھنا

خون بہا

نوحہ

یاد آتا ہے تو کیوں اس سے گلہ ہوتا ہے

چاند اور میں

وارفتگی میں دل کا چلن انتہا کا تھا

سہرا

لگا کے زخم بدن پہ قبائیں دیتا ہے۔

چلے تھے یار بڑے زعم میں ہوا کی طرح

اگر یہ سب کچھ نہیں

یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی حالتیں کرنی
فقیہہ شہر کی مجلس سے کچھ بھلا نہ ہوا۔
ویت نام

دیباچہ

یہ قصہ پرانا ہے
جب بعض ہونٹوں نے چاہا
کہ لفظوں کو آواز کی زندگی دیں
تو خود اُن کو زہرِ آب پینا پڑا تھا
کہ اہلِ حکم کو یہ ڈر تھا
یہ الفاظ
آواز کی زندگی سے
کوئی داستاں بن نہ جائیں

. . . اور وہ ہونٹ چپ ہو گئے تھے
سسکتے تڑپتے ہوئے لفظ
قاتل کی شمشیر سے نیم جاں
مدتوں تک فراق صدائیں
دھڑکتے رہے ہیں
کسے کیا خبر تھی
کہ ان بسملوں کا لہو . . . قطرہ قطرہ

لکیروں کی صورت دمکتا رہے گا

اور اب یہ
لہو کی لکیریں
بجائے خود اک داستان بن گئی ہیں۔

غزل

ہوئی ہے شام تو آنکھوں میں بس گیا پھر تو
کہاں گیا ہے مرے شہر کے مسافر تو

مری مثال کہ اک نخلِ خشک صحرا ہوں
ترا خیال کہ شاخِ چمن کا طائر تو

میں جانتا ہوں کہ دنیا تجھے بدل دے گی
میں مانتا ہوں کہ ایسا نہیں بظاہر تو

ہنسی خوشی سے بچھڑ جا اگر بچھڑنا ہے
یہ ہر مقام پہ کیا سوچتا ہے آخر تو

فضا اداس ہے، رت مضمحل ہے، میں چپ ہوں
جو ہو سکے تو چلا آ کسی کی خاطر تو

فراز تو نے اسے مشکلوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحبِ زر اور صرف شاعر تو

وفا پرست صلیبیں

وہ دن بھی یاد ہیں مجھ کو کہ جب مری دنیا
کہاں کے جسم کہ سایوں کو بھی ترستی تھی
پھرا ہوں کوچہ بہ کوچہ متاعِ درد لئے
اگرچہ خلق مری سادگی پہ ہنستی تھی

سدا جلاتی رہی ہے مجھے یہ محرومی
وہی تھا میں وہی صحرائے آرزو کے سراب
کوئی نہ تھا کہ میں جس کے حضور نذر کروں
یہ آنسوؤں کے چراغاں، یہ شاعری کے گلاب

یہ زخم وہ تھے جو فن کے لئے چراغ بنے
مرا شریکِ سفر بس مرا شعور رہا
کسی سے کر نہ سکا دردِ نارسا کا گلہ
وہ روز و شب تھے کہ تنہائیوں سے چور رہا

رہِ طلب میں پھر اک یہ مقام بھی آیا
کہ دل گرفتہ ہے تو میری زندگی کے لئے

میں دیکھتا ہوں کہ تیری اداس آنکھوں میں
وفا کی آنچ لئے ہیں عقیدتوں کے دیئے

کسے عزیز نہ ہوگی تیری طلب کی لگن
ہزار دل پہ پڑی ہو غمِ زمانہ کی دھول
کسے غرور نہ ہوگا اگر تری چاہت
کھلائے دشتِ تمنّا میں التفات کے پھول

مگر تجھے نہیں معلوم قربتوں کے الم
تری نگاہ مجھے فاصلوں سے چاہتی ہے
تجھے خبر نہیں شاید کہ خلوتوں میں مری
لہو اگلتی ہوئی زندگی کراہتی ہے

تجھے خبر نہیں شاید کہ ہم وہاں ہیں جہاں
یہ فن نہیں ہے اذیت ہے زندگی بھر کی
کبھی گلوئے جنوں پر کمند پڑتی ہے
کبھی قلم کی زباں پر ہے نوک خنجر کی

ہم اس قبیلۂ وحشی کے دیوتا ہیں کہ جو
پجاریوں کی عقیدت پہ پھول جاتے ہیں
اور ایک رات کے معبود صبح ہوتے ہی
وفا پرست صلیبوں پہ جھول جاتے ہیں

غزل

عجیب رت تھی کہ ہر چند پاس تھا وہ بھی
بہت ملول تھا میں، اداس تھا وہ بھی

کسی کے شہر میں کی گفتگو ہواؤں سے
یہ سوچ کر کہ کہیں آس پاس تھا وہ بھی

ہم اپنے زعم میں خوش تھے کہ اُسکو بھول چکے
مگر گماں تھا یہ بھی، قیاس تھا وہ بھی

کہاں کا اب غم دنیا کہاں کا اب غم جاں
وہ دن بھی تھے کہ ہمیں یہ بھی راس تھا وہ بھی

فراز تیرے گریباں پہ کل جو ہنستا تھا
اُسے ملے تو دریدہ لباس تھا وہ بھی

عقیدت

میں کتنی وارفتگی سے اُسے سُنا رہا تھا
وہ ساری باتیں وہ سارے قصّے
جو اس سے ملنے سے پیشتر
مری زندگی کی حکایتیں تھیں

میں کہہ رہا تھا
کہ اور بھی لوگ تھے
جنہیں میری آرزو تھی مری طلب تھی
کہ جن سے میری محبتوں کا رہا تعلق
کہ جن کی مجھ پر عنایتیں تھیں

میں کہہ رہا تھا
کہ ان میں کچھ کو تو میں نے
جاں سے عزیز جانا
مگر انہیں میں سے بعض کو
میری بے دلی سے شکایتیں تھیں

میں ایک اک بات
ایک اک جرم کی کہانی
دھڑکتے دل کانپتے بدن سے سُنا رہا تھا
مگر وہ پتھر بنی
مجھے اس طرح سے سنتی رہی
کہ جیسے مرے لبوں پر
کسی مقدس ترین صحیفے کی آئتیں تھیں

سچ کا زہر

تجھے خبر بھی نہیں
کہ تیری اداس ادھوری
محبتوں کی کہانیاں
جو بڑی کشادہ دلی سے
ہنس ہنس کے سن رہا تھا
وہ شخص تیری صداقتوں پر فریفتہ
باوفا و ثابت قدم
کہ جس کی جبیں پہ
تمام رقابتوں کی جلن سے
کوئی شکن نہ آئی
وہ ضبط کی کربناک شدت سے
دل ہی دل میں
خموش، چپ چاپ
مر گیا ہے۔

غزل

ہر آشنا میں کہاں خوئے محرمانہ وہ
کہ بے وفا تھا مگر دوست تھا پرانا وہ

کہاں سے لائیں اب آنکھیں اُسے کہ رکھتا تھا
عداوتوں میں بھی اندازِ مخلصانہ وہ

جو ابر تھا تو اُسے ٹوٹ کر برسنا تھا
یہ کیا کہ آگ لگا کر ہوا روانہ وہ

پکارتے ہیں مہ و سال منزلوں کیطرح
لگا ہے توسنِ ہستی کو تازیانہ وہ

ہمیں بھی غم طلبی کا نہیں رہا یارا
ترے بھی رنگ نہیں گردشِ زمانہ وہ

اب اپنی خواہشیں کیا کیا اُسے رلاتی ہیں
یہ بات ہم نے کبھی کہی تھی مگر نہ مانا وہ

یہی کہیں گے کہ بس صورت آشنائی تھی
جو عہد ٹوٹ گیا یاد دلا گیا وہ

اس ایک شکل میں کیا کیا نہ صورتیں دیکھیں
نگار تھا نظر آیا نگار خانہ وہ

فراز خواب سی غفلت دکھائی دیتی ہے
جو لوگ جانِ جہاں تھے ہوئے فسانہ وہ

کون سا نام تجھے دوں؟

یوں بھی گذری ہے کہ جب درد میں ڈوبی ہوئی شام
گھول دیتی ہے مری سوچ میں زہرِ ایّام
زرد پڑ جاتا ہے جب شہرِ نظر کا مہتاب
خون ہو جاتا ہے ہر ساعتِ بیدار کا خواب
ایسے لمحوں میں عجب لطفِ دل آرام کے ساتھ
مہرباں ہاتھ ترے ریشم و بلور سے ہاتھ

اپنے شانوں پہ مرے سر کو جھکا دیتے ہیں
جس طرح ساحلِ امید سے بے بس چہرے
دیر تک ڈوبنے والے کو صدا دیتے ہیں

یوں بھی گذری ہے کہ جب قرب کی سرشاری میں
چمک اٹھتا ہے نگاہوں میں ترے حسن کا شہر
نہ غمِ دہر کی تلچھٹ، نہ شبِ ہجر کا زہر
مجھ کو ایسے میں اچانک بے وجہ سکوت

کوئی بے فیض نظر یا کوئی تلوار سی بات
ان گنت درد کے رشتوں میں پرو دیتی ہے
اس طرح سے کہ ہر آسودگی رو دیتی ہے

کون سا نام تجھے دوں مرے ظالم محبوب
تو ہی قاتل ہے مرا تو ہی مسیحا میرا!

غزل

تیرے قریب آ کے بڑی اُلجھنوں میں ہوں
میں دشمنوں میں ہوں کہ ترے دوستوں میں ہوں

مجھ سے گریز پا ہے تو ہر راستہ بدل!
میں سنگِ راہ ہوں تو سبھی راستوں میں ہوں

تو آچکا ہے سطح پہ کب سے خبر نہیں
بے درد میں ابھی انہی گہرائیوں میں ہوں

اے یارِ خوش دیار تجھے کیا خبر کہ میں
کب سے اداسیوں کے گھنے جنگل میں ہوں

تو لوٹ کر بھی اہلِ تمنّا کو خوش نہیں
میں لُٹ کے بھی وفا کے انہیں قافلوں میں ہوں

بدلا نہ مرے بعد بھی موضوعِ گفتگو
میں جا چکا ہوں پھر بھی تری محفلوں میں ہوں

مجھ سے بچھڑ کر تو بھی تو روئے گا عمر بھر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تری خواہشوں میں ہوں

تو ہنس رہا ہے مجھ پہ مرا حال دیکھ کر
اور پھر بھی میں شریک ترے قہقہوں میں ہوں

خود بھی مثالِ لالۂ صحرا لہو لہو
اور خود فراز اپنے تماشائیوں میں ہوں

تخلیق

درد کی آگ بجھا دو کہ ابھی وقت نہیں
زخمِ دل جاگ سکے، نشترِ غم رقص کرے
جو بھی سانسوں میں گھُلا ہے اُسے عریاں کردو
چھپ بھی شعلہ ہے مگر کوئی نہ الزام دھرے

ایسے الزام کہ خود اپنے تراشے ہوئے بُت
جذبۂ کاوشِ خالق کو نگونسار کریں
موقلم حلقۂ ابرو کو بنا دے خنجر
لفظ نوحوں میں رقم مدحِ رُخِ یار کریں
رقصِ مینا سے اُٹھے نغمۂ رقصِ بسمل
ساز خود اپنے مغنی کو گنہگار کریں

مرہمِ اشک نہیں زخمِ طلب کا چارہ
خوں بھی روؤ گے تو کس خاک کی بیج ذبح ہوگی
کانپتے ہاتھوں سے ٹوٹی ہوئی بنیادوں پر
جو بھی دیوار اٹھاؤ گے وہی کج ہو گی
کوئی پتھر ہو کہ نغمہ کوئی پیکر ہو کہ رنگ
جو بھی تصویر بناؤ گے اپاہج ہو گی

یہ کیسی رُت ہے

یہ کیسی رت ہے
کہ ہر شجر
صحن گلستاں میں
ملول و تنہا سُلگ رہا ہے
طیور چپ چاپ کب سے منقار زیر پر ہیں
ہوائیں نوحہ کناں
کہ اس باغ کی بہاریں
گئیں، تو پھر لوٹ کر نہ آئیں

یہ کیسی رت ہے
نہ برف باری کے دن
کہ شاخوں کے پیرہن پہ
سپیدۂ صبح کا گماں ہو
نہ فصل گل ہے
کہ ہر طرف شور جانفروشاں سے
کوئے محبوب کا سماں ہو

نہ دور پت جھڑ کا ہے
کہ بے جان کونپلوں کو
امیدِ فردائے مہرباں ہو

یہ کیسی رت ہے
کوئی تو بولے
کوئی تو دھڑکے
کوئی تو بھڑکے

(۲)

غزل

آنکھ سے دور نہ ہو دل سے اُتر جائے گا
وقت کا کیا ہے گزرتا ہے گزر جائے گا

اتنا مانوس نہ ہو خلوتِ غم سے اپنی
تو کبھی خود کو بھی دیکھے گا تو ڈر جائے گا

ڈوبتے ڈوبتے کشتی کو اچھالا دے دوں
میں نہیں کوئی تو ساحل پہ اتر جائے گا

زندگی تری عطا ہے تو یہ جانے والا
تیری بخشش تری دہلیز پہ دھر جائے گا

ضبط لازم ہے مگر دکھ ہے قیامت کا فراز
ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مر جائے گا

غزل

کب یاروں کو تسلیم نہیں کب کوئی عدو انکاری ہے
اس کوئے طلب میں ہم نے بھی دل نذر کیا جاں واری ہے

جب ساز سلاسل بجتے تھے ہم اپنے لہو سے سجتے تھے
وہ رسم ابھی تک باقی ہے یہ رسم ابھی تک جاری ہے

کچھ اہلِ ستم کچھ اہلِ حشم میخانہ گرانے آئے تھے
دہلیز کو چوم کے چھوڑ گئے دیکھا کہ یہ پتھر بھاری ہے

جب پرچمِ جاں لے کر نکلے ہم خاک نشیں مقتل مقتل
اس وقت سے لے کر آج تلک جلاد پہ ہیبت طاری ہے

زخموں سے بدن گلزار سہی پر ان کے شکستہ تیر گنو
خود ترکش والے کہہ دیں گے یہ بازی کس نے ہاری ہے

ہم سہل انگار سہی لیکن کیوں اہلِ ہوس یہ بھول گئے
یہ خاکِ وطن ہے جاں اپنی اور جان تو سب کو پیاری ہے

میں کیوں اداس نہیں

(جنگ ستمبر ۶۵ء کے موقع پر لکھی گئی)

لہولہان مرے شہر میرے یار شہید
مگر یہ کیا کہ مری آنکھ ڈبڈبائی نہیں
نظر کے زخم جگر تک پہنچ نہیں پائے
کہ مجھ کو منزلِ اظہار تک رسائی نہیں
میں کیا کہوں کہ پشاور سے چاٹگام تلک
مرے دیار نہیں تھے کہ میرے بھائی نہیں

وہی ہوں میں مرا دل بھی وہی جنون بھی ہوں
کسی پہ تیر چلے جاں فگار اپنی ہو
وہ ہیروشیما ہو، ویت نام ہو کہ بٹ مالو[1]
کہیں بھی ظلم ہو آنکھ اشکبار اپنی ہو
یہی ہے فن کا تقاضا یہی مزاج مرا
متاعِ درد سبھی پر نثار اپنی ہو

[1] کشمیر کا ایک قصبہ

نہیں کہ درد نے پتھر بنا دیا ہے مجھے
نہ یہ کہ آتشِ احساس سرد ہے میری
نہیں کہ خونِ جگر سے تہی ہے میرا قلم
نہ یہ کہ لوحِ وفا برگِ زرد ہے میری
گواہ ہیں مرے احباب میرے شعر ثبوت
کہ منزل رسن و دار گرد ہے میری

بجا کہ امن کا بربط اٹھائے آج تلک
ہمیشہ گیت محبت کے گائے ہیں میں نے
عزیز ہے مجھے معصوم صورتوں کی ہنسی
بجا کہ پیار کے نغمے سنائے ہیں میں نے
چھڑک کے اپنا لہو اپنے آنسوؤں کی پھوار
ہمیشہ جنگ کے شعلے بجھائے ہیں میں نے

میں سنگدل ہوں نہ بیگانۂ وفا یارو
نہ یہ کہ میں ہوں کسی خواب زار میں کھویا
تمہیں خبر ہے کہ دل پر خراش جب بھی لگے
تو بند رہ نہیں سکتا مرا لب گویا

وہ مرگ ہم نفساں پہ حزیں نہیں ہے تو کیوں
جو فاطمی و لومبا کی موت پر رو دیا

دلاورانِ وفا کیش کی شہادت پر
مرا جگر بھی لہو ہے یہ وقفِ یاس نہیں
سیالکوٹ کے مظلوم ساکنوں کے لئے
جز آفریں کے کوئی لفظ میرے پاس نہیں
میں کیسے خطۂ لاہور کے پڑھوں نوحے
یہ شہرِ زندہ دلاں آج بھی اداس نہیں

جنوں فروغ ہے یارو عدو کی سنگ زنی
ہزار شکر کہ معیارِ عشق پست نہیں
مناؤ جشن کہ روشن ہیں مشعلیں اپنی
دریدہ سر ہیں تو کیا غم شکستہ دست نہیں
مرے وطن کی جبیں پر دمک رہا ہے جو زخم
وہ نقشِ فتح ہے داغِ غم شکست نہیں

بگریزد از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلہ ما نیست

غزل

اب شوق سے کہ جاں سے گذر جانا چاہیئے
بول اے ہوائے شہر کدھر جانا چاہیئے

کب تک اسی کو آخری منزل کہیں گے ہم
کوئے مراد سے بھی ادھر جانا چاہیئے

وہ وقت آگیا ہے کہ ساحل کو چھوڑ کر
گہرے سمندروں میں اُتر جانا چاہیئے

اب رفتگاں کی بات نہیں کارواں کی ہے
جس سمت بھی ہو گردِ سفر جانا چاہیئے

کچھ تو ثبوتِ خونِ تمنّا کہیں ملے
ہے دل تہی تو آنکھ کو بھر جانا چاہیئے

یا اپنی خواہشوں کو مقدس نہ جانتے
یا خواہشوں کے ساتھ ہی مر جانا چاہیئے

گئی رُت

پھر آگئی ہے گئی رُت تمہیں خبر بھی نہیں
خبر مجھے بھی نہیں تھی کہ رات پچھلے پہر
کسی نے مجھ سے کہا جاگ اے دریدہ جگر
نشتہ ہے سرِ دہلیز کوئی بام نشیں

بدل چکا تھا سبھی کچھ تمہارے جاتے ہی
فلک کا چاند، زمیں کے گلاب بکھر گئے
وہ راکھ خواب ہوئی پھر وہ خواب راکھ ہوئے
تم آسکو تو میں سمجھوں تمہارے آتے ہی

ہر ایک نقش وہی آج بھی ہے جو کل تھا
یہ راکھ خواب بنے خواب سے گلاب بنے
ہر اک ستارۂ مژگان سے مہتاب بنے
برس فراق کا جیسے وصال کا پل تھا

کردار

ہم ابھی ایستادہ تھے
اب سے کچھ پہلے
وفا کے فرشِ پائندہ پہ
خوش وقتی کے رنگین شامیانوں کے تلے
اپنے ہاتھوں میں قرار و قول کی شمعیں لئے
آندھیوں میں زلزلوں میں
تاقیامت ساتھ دینے کے لئے
آمادہ تھے
ایک دوسرے کے اس قدر دلدادہ تھے

دیکھنے والوں میں شامل
یار بھی اغیار بھی
چند آنکھوں میں نمی
چند آنکھوں میں حقارت، برہمی
چند آنکھوں میں سکوتِ دائمی
جم گئے سائے ادھر
اور کانپ اٹھی اس طرف دیوار بھی

دشمنوں کو بھی یقیں
اور بدگماں کچھ ہم نشیں۔ غم خوار بھی
دیکھنے والوں نے دیکھا

کس طرح صدیاں اچانک
ثانیوں میں بٹ گئیں
شامیانوں کی طنابیں کٹ گئیں
بجھ گئیں شمعیں قرار و قول کی
فرشِ وفا کی سمت در پائندہ سلیں بھی پھٹ گئیں
اور دو پیکر
خود اپنے خنجروں کے وار سے
خاک و خوں میں تربتر
فرش پہ افتادہ تھے
ہم ابھی ایستادہ تھے۔

غزل

نظر بجھی تو کرشمے بھی روز و شب کے گئے
کہ اب تلک نہیں آئے ہیں لوگ جب کے گئے

سنے گا کون تری بے وفائیوں کا گلہ
یہی ہے رسمِ زمانہ تو ہم بھی اب کے گئے

مگر کسی نے ہمیں ہم سفر نہیں جانا
یہ اور بات کہ ہم ساتھ ساتھ سب کے گئے

اب آئے ہو تو یہاں کیا ہے دیکھنے کے لئے
یہ شہر کب سے ہے ویراں وہ لوگ کب کے گئے

گرفتہ دل تھے مگر حوصلہ نہیں ہارا تھا
گرفتہ دل ہیں مگر حوصلے بھی اب کے گئے

تم اپنی شمعِ تمنا کو رو رہے ہو فراز
ان آندھیوں میں تو پیارے چراغ سب کے گئے

روزنا جرمن نژاد

روزنا جرمن نژاد

اس کے ہونٹوں میں حرارت

جسم میں طوفان

برہنہ پنڈلیوں میں آگ

نیت میں فساد

رنگ و نسل و قامت قد

سرزمین و دین کے سب تفرقوں سے بے نیاز

ہر کسی سے بے تکلف ایک حد تک دلنواز

وہ سبھی کی ہم پیالہ ہم نفس

عمر شاید بیس سے اوپر برس یا دو برس

روزنا جرمن نژاد

اور دیکھنے والوں میں سب

اس کی آسودہ نگاہی بے محابا میگساری کے سبب

پیکر تسلیم و سراپا طلب

ان میں ہر اک کی متاعِ کُل

بہائے التفات نیم شب

روزنا جرمن نژاد
اور اس کا دل زخموں سے چور
اپنے ہمدردوں سے ہمسایوں سے دور
گھر کی دیواریں نہ دیواروں کے سایوں کا سرور
جنگ کے آتشکدے کا رزق کب سے بن چکا
ہر آہنی بازو کا خواب
ہر چاند کے چہرے کا نور

خلوتیں خاموش و ویراں
اور ہر دہلیز پر اک مضطرب مرمر کا بت
ایستادہ ہے بچشمِ ناصبور
کون ہے اپنوں میں باقی
توسنِ راہِ طلب کا شہسوار
ہر دریچے کا مقدر انتظار

اجنبی مہماں کی دستکِ خواب
شاید خواب کی تعبیر بھی
چند لمحوں کی رفاقت جاوداں بھی
حسرت تعبیر بھی

الوداعی شام، آنسو، عہد و پیمان
مضطرب صیاد بھی نخچیر بھی
کون کر سکتا ہے ورنہ ہجر کے کالے سمندر کو عبور
اجنبی مہماں کا اک حرفِ وفا
نومید چاہت کا غرور
روز نا اب اجنبی کے ملک میں خود اجنبی
پھر بھی چہرے پر اداسی ہے نہ آنکھوں میں تھکن
اجنبی کا ملک جس میں چار سو
تاریکیاں ہی خیمہ زن
سب کے سایوں سے بدن
روز نامر مر کا بُت
اور اس کے گرد
ناچتے سائے بہت
سب کے ہونٹوں پر وہی حرفِ وفا
ایک ہی سب کی صدا
وہ سبھی کی ہم پیالہ ہم نفس
عمر شاید بیس سے اوپر برس یا دو برس
اس کی آنکھوں میں تجسس اور بس

غزل

بدن میں آگ سے چہرہ گلاب جیسا ہے
کہ زہرِ غم کا نشہ بھی شراب جیسا ہے

وہ سامنے ہے مگر تشنگی نہیں جاتی
یہ کیا ستم ہے کہ دریا سراب جیسا ہے

کہاں وہ قرب کہ اب تو یہ حال ہے جیسے
ترے فراق کا عالم بھی خواب جیسا ہے

مگر کبھی کوئی دیکھے کوئی پڑھے تو سہی
دل آئینہ ہے تو چہرہ گلاب جیسا ہے

بہار خوں سے چمن زار بن گئے مقتل !
جو نخلِ دار ہے شاخِ گلاب جیسا ہے

فراز سنگِ ملامت سے زخم زخم سہی
ہمیں عزیز ہے خانہ خراب جیسا ہے

فضا نورد بادل

میں سایۂ نخل میں کھڑا تھا
جب ایک فضا نورد بادل
لہراتا ہوا نظر پڑا تھا

یوں قلب و جگر سے آگ اٹھی
برسوں کی طویل تشنہ کامی!
یک لخت ہی جیسے جاگ اٹھی

پل بھر میں بدن دہک رہا تھا
میں سایۂ نخل سے نکل کر
بادل کی طرف لپک رہا تھا

بادل تھا سمندروں کا پیاسا
یہ اس کا کرم کہ چند لمحے
وہ مجھ کو بھی دے گیا دلاسا

دل پر لئے داغ نامرادی
چاہا کہ پلٹ چلوں ادھر ہی
جس سمت سے درد نے صدا دی

دیکھا تو وہ رُت بھی جا چکی تھی
مایوس کُن انتظار کی دھوپ
اس نخلِ وفا کو کھا چکی تھی

غزل

کہا تھا کس نے تجھے آبرو گنوانے جا
فراز اور اُسے حالِ دل سنانے جا

کل اک فقیر نے کس سادگی سے مجھ سے کہا
تری جبیں کو بھی ترسیں گے آستانے جا

اُسے بھی ہم نے گنوایا تری خوشی کے لئے
تجھے بھی دیکھ لیا ہے اے زمانے جا

بہت ہے دولتِ پندار پھر بھی دیوانے
جو تجھ سے روٹھ چکا ہے اُسے منانے جا

سُنا ہے اس نے سوئمبر کی رسم تازہ کی
فراز تو بھی مقدر کو آزمانے جا

غزل

نہ اب جواز نہ موقع ہے ہاتھ ملنے کا
ہمیں کو شوق رہا راستے بدلنے کا

پہنچ گئے سرِ منزل بخوبی، قسمت
مگر وہ لطف کہاں ساتھ ساتھ چلنے کا

میں آپ اپنے ہی پندار کے حصار میں ہوں
بجز شکست کہاں راستہ نکلنے کا

وہ ساعتیں تو ہواؤں کے ساتھ جا بھی چکیں
نظر میں اب بھی ہے منظر چراغ جلنے کا

وہ سرد مہر سہی پر نگاہِ لطف کے بعد
فراز دیکھ سماں برف کے پگھلنے کا

فصلِ رائیگاں

زندگی کے خواب فصلِ رائیگاں
تو دریدہ دل میں آشفتہ بیاں
زندگی کے خواب فصلِ رائیگاں

رائیگاں ہر درد کے سورج کی دھوپ
آبلے ہاتھوں کے ماتھوں کا عرق
گیسوؤں کے ابر ہونٹوں کی شفق
میرے دل کی آگ تیرا رنگ روپ

رائیگاں خونِ وفا کی ندیاں
کشتِ بے حاصل کا حاصل بے نشاں

آنسوؤں کی جھیل دوپہروں کی لُو
جسم شل، احساس مُردہ دل لہو

چار جانب ریت کے ٹیلے رواں
کوئی نوحہ گر نہ کوئی چشمِ نم
صرف ہم تو بھی کہاں میں بھی کہاں
جیسے ویرانے میں لاشیں بے اماں

بے کفن، بے گور، رزقِ کرگساں
اور یہ یادیں بھی کچھ لمحوں کی ہیں
جس طرح صحرا میں قدموں کے نشاں
جس طرح تعزیتی خاموشیاں

سلامتی کونسل

پھر چلے ہیں مرے زخموں کا مداوا کرنے
میرے غم خوار اسی فتنہ گر دہر کے پاس
جس کی دہلیز پہ ٹپکی ہیں لہو کی بوندیں
جب بھی پہنچا ہے کوئی سوختہ جاں کشتۂ یاس
جس کے ایوان عدالت میں فروکش قاتل
بزم آرا و سخن گستر و فرخندہ لباس
ہر گھڑی نعرۂ زناں "امن و مساوات کی خیر"
زر کی میزان میں رکھے ہوئے انسان کا ماس

کون اس قتل گہہ ناز کے سمجھے اسرار
جس نے ہر دشنہ کو پھولوں میں چھپا رکھا ہے
امن کی فاختہ اڑتی ہے نشاں پر لیکن!
نسل انساں کو صلیبوں پہ چڑھا رکھا ہے
اس طرف نطق کی باران کرم اور ادھر
کاسۂ سر سے مناروں کو سجا رکھا ہے

جب بھی آیا ہے کوئی کشتۂ بیداد ئے سے
مرہم وعدۂ فردا کے سوا کچھ نہ ملا
یہاں قاتل کے طرفدار ہیں سارے قاتل
کاہشِ دیدۂ پُرخوں کا صلہ کچھ نہ ملا

کاشیر کو ربا ویت نام و دشکن کانگو
کسی بسمل کو بجز حرفِ دعا کچھ نہ ملا

قصرِ انصاف کی زنجیر ہلانے والو
کجکلاہوں پہ قیامت کا نشہ ہے طاری
اپنی شمشیر پہ کشکول کو ترجیح نہ دو
دم ہو بازو میں تو ہر ضرب جنوں ہے کاری
اس جزیرہ میں کہیں نور کا مینار نہیں
جس کے اطراف میں اک قلزمِ خوں ہے جاری

"جوہر جام جم از کانِ جہاں دگر است
تو توقع ز گلِ کوزہ گراں می داری"

نوحہ گر چپ ہیں

نوحہ گر چپ ہیں کہ روئیں بھی تو کس کو روئیں
کوئی اس فصلِ ہلاکت میں سلامت بھی تو ہو
کون سا دل ہے کہ جس کے لئے آنکھیں کھوئیں
کوئی بسمل کسی شب خوں کی علامت بھی تو ہو

۶۸۷

شکر کی جا ہے کہ بے نام و نسب کے چہرے
مسندِ عدل کی بخشش کے سزاوار ہوئے
کتنی تکریم سے دفنائے گئے سوختہ تن
کتنے اعزاز کے حامل یہ گنہگار ہوئے

یوں بھی اس دور میں جینے کا کسے تھا یارا
بے نوا بازوئے قاتل سے گلہ مند نہ ہوں
زندگی یوں بھی تو مفلس کی قبا تھی لیکن
دلفگاروں کے کفن میں بھی تو پیوند نہ ہوں

ناوکِ ظلِ الٰہی اجل آہنگ سبھی
شکر کی جا ہے کہ سونے کی انی رکھتے ہیں
جاں گنوائی بھی تو کیا مدفن درِ قد تو ملا
شاہ جمجاہ طبیعت تو غنی رکھتے ہیں

غزل

گذرا ہوں جس طرف سے بھی پتھر لگے مجھے
ایسے بھی کیا تھے لعل و جواہر لگے مجھے

وہ ہو چکی شفا کہ مداوائے درد دل
اب تیری دسترس سے بھی باہر لگے مجھے

ترسا دیا ہے ابرِ گریزاں نے اس قدر
برسے جو بوند بھی تو سمندر لگے مجھے

تھامے رہو گے جسم کی دیوار تاب کے
یہ زلزلہ تو روح کے اندر لگے مجھے

گر روشنی یہی ہے تو اے بدنصیب شہر
اب تیرگی ہی تیرا مقدر لگے مجھے

منزل کہاں کی زادِ سفر کو بچائیو
اب رہزنوں کی نیتِ رہبر لگے مجھے

وہ مطمئن کہ سب کی زباں کاٹ دی گئی
ان کی خموشیوں سے مگر ڈر لگے مجھے

وہ قحطِ حرفِ حق ہے کہ اس عہد میں فراز
خود سا گنہگار پیمبر لگے مجھے

غزل

سرِ قلم پہ رہی نوک جس کے خنجر کی
سنا ہے اُس کی زبان بھی ہوئی ہے پتھر کی

رواں ہے قلزمِ خوں اندرونِ شہر بھی دیکھ
کہ خوش نما تو بہت ہے فصیل باہر کی

اجاڑ پڑ گئے موسموں کو روتے ہیں
ہر آبجو کو ہوس پی گئی سمندر کی

فقیہہ شہر جبیں پر کلاہِ زر رکھے
سنا رہا ہے ہمیں آیتیں مقدر کی

خود اپنے خوں میں نہائے ہوئے گر چپ ہیں
یہ لوگ ہیں کہ چٹانیں ہیں سرخ پتھر کی

وہ ایک شخص کہ سورج کے روپ میں آیا
چرا کے لے گیا شمعیں فراز ہر گھر کی

قاتل

قاتل چپ ہے
خوں آلودہ ہاتھ ہیں اب تک
خنجر تھر تھر کانپ رہا ہے
لوگوں کا انبوہ اُسے
گھیرے میں لے کر
چیخ رہا ہے
یہ قاتل ہے
یہ قاتل ہے
خاک اور خوں میں لت پت لاش
کے ہونٹوں پر
اک بات جمی ہے
یہ قاتل ہے
لیکن کس کا
یہ اپنی تخلیق کا قاتل
اس نے خود کو قتل کیا ہے
لوگوں کا انبوہ مگر

۵۵

کب سنتا ہے
کون ہے قاتل
کس نے
کس کو قتل کیا ہے ؟

نہیں ہے یوں

نہیں ہے یوں کہ مرا دکھ مری حدود میں ہے
نہ صرف دل ہی دریدہ نہ صرف جاں ہی فگار
نہ صرف دیکھتی آنکھوں میں حسرتوں کا دھواں
نہ صرف ہاتھ شکستہ نہ سر پہ زخم ہزار

جو یوں بھی ہو تو بڑی بات ہے تری قربت
تری وفا، تری چاہت تری مسیحائی
ہر ایک زخم کو دھو دے شفیق ہاتھوں سے
ہر ایک درد کو چن لے تری دل آرائی

مگر یہ درد یہ دکھ کب مری حدود میں ہے
کہیں نہیں مرا پیکر کہاں نہیں یہ فغاں
تو اک وجود کو زندہ تو کر چکے لیکن
ہر اک صلیب پہ میرا ہی جسم آویزاں
ہر ایک تیر ستم پر مرا لہو لرزاں
کسے کسے تو بچائے گی اے مری درماں

غزل

مزاج ہم سے زیادہ جدا نہ تھا اُس کا
جب اپنے طور یہی تھے تو کیا گلہ اُس کا

وہ اپنے زعم میں تھا بے خبر رہا مجھ سے
اُسے گماں بھی نہیں میں نہیں رہا اُس کا

وہ برق رو تھا مگر رہ گیا کہاں جانے
اب انتظار کریں گے شکستہ پا اُس کا

چلو یہ سیل بلاخیز ہی بنے اپنا
سفینہ اُس کا، خدا اُس کا، ناخدا اُس کا

یہ اہل درد بھی کس کی دہائی دیتے ہیں
وہ چُپ بھی ہو تو زمانہ ہے ہمنوا اُس کا

ہمیں نے ترکِ تعلق میں پہل کی کہ فراز
وہ چاہتا تھا مگر حوصلہ نہ تھا اُس کا

غزل

چلو اُسی سے کہیں دل کا حال جو بھی ہو
وہ چارہ گر تو ہے اس کو خیال جو بھی ہو

اسی کے درد سے ملتے ہیں سلسلے جاں کے
اسی کے نام لگا دو ملال جو بھی ہو

مرے نہ ہار کے ہم قیس و کوہکن کیطرح
اب عاشقی میں ہماری مثال جو بھی ہو

یہ رہگذر پہ جو شمعیں دمکتی جاتی ہیں
اسی کا قامتِ زیبا ہے چال جو بھی ہو

فراز اس نے وفا کی کہ بے وفائی کی
جواب وہ تو ہمیں ہیں سوال جو بھی ہو

کشن بی بی

تو جب
بمبریت کے قاتل پہاڑوں کی صلیبوں سے اُتر آ۔
تو یہ جانا
کہ ہم دشت عدم کو پار کر آئے
ہر اک کے پاؤں چھلنی جسم شل
اعضا تھکن سے چور
لیکن سب
ہراسِ مرگ سے بے جان، بے حس تھے
سبھی یوں زرد رو جیسے
ابھی تک آسمانوں کے سفر سے لوٹ کر
روحیں نہیں آئیں
چلو ہم سب کے سب زندہ ہیں
جیسے بھی ہیں یک جا ہیں
ضیاء، باسط، سعید اور میں
ہمارا میزبان کب سے نہ جانے
گھر کے دروازے کھُلے چھوڑے

کافرستان کی ایک لڑکی

سبک شہتیر کے پل پر ہمارا منتظر تھا
اس کو یہ معلوم تھا
ہم اجنبی مہماں
سیاحت کے لئے کن مشکلوں سے
ہفت خواں طے کر کے
اس وادی میں آئیں گے

چناروں کے بلند اشجار
انگوروں کی بیلیں
چار سو سبزہ
ہوائیں بید مُشک و عود و مُر کی خوشبوؤں
سے چور، بوجھل
طائران خوش نما و خوش نوا، بے کل
سبک رفتار چشموں کی تہوں میں
پتھروں کا نیلم و یاقوت سا جھل مل
ادھر کچھ دور بزغالوں کے گلے
نوجوان چرواہیوں کے دودھیا چہروں کی صورت
برف سے شفاف و دل آرا
فضا حیرت فزا ۔ سحر آفرین دنیا
"مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را"

ہمارا میزبان مفلس تھا
لیکن شام کو خوانِ ضیافت دیکھ کر

ہم خس بد نداں تھے
کشادہ طشت میں بزغالۂ بریاں
لیلک میں آبِ تاک
اور کشتیوں میں ڈھیر سیبوں کے
الاؤ کی دہکتی آگ
کتنی گرم کتنی خوب صورت تھی

مگر ہم منتظر اس پل کے تھے
جب کافرستاں کی جواں پریاں
زمینی خلد کی حوریں
دف و مردنگ کی تھاپوں پہ رقصاں
اپنے محبوبوں کی فرقت کے
نشیلے گیت گائیں گی
الف لیلیٰ کے شہزادوں کی صورت
ہم میں ہر اک
اس طلسماتی فضا کے سحر میں گم تھا۔

بُتانِ آذری کا رقص جاری تھا
سیہ ملبوس میں لپٹے ہوئے
دیر کے بُت
مہتاب سے پیکر
سبھی باہوں میں باہیں ڈال کر زنجیر کی صورت
کماں کی شکل میں جُنباں

کہ جیسے دیوتاؤں کے رتھوں کی گھوڑیاں
وحشت سے پا کوباں
دف و دمامہ و مردنگ کے آہنگ میں
آہستہ آہستہ
کھنکتے قہقہے۔ مجوب آوازیں بھی
شامل ہوگئیں آخر
کہ جیسے نقرئی گھنگرو
اچانک جھنجھنا اٹھیں۔

سبھی غارت گرِ تمکین و ہوش و دشمنِ ایماں
ہر اک فتنہ بزورِ اں
گروہ سرگروہِ نازنیناں
غیرتِ ناہید

جانِ حلقۂ خوباں
گلشن بی بی
قد و قامت قیامت
جنبشیں جادو
بدن طوفان

ضیائے کردار ہیں گوتم
مجسم صدق و ایثار و وفا
درد آشنا و نفس کش ہمدم
لہو اس کا بھی اس شعلے نے گرمایا

مگر سب ساتھیوں سے کم
بتانِ آذری رقصاں
مگر باسط جو اک فنکار
لیکن شکوہ سنجِ زندگی ہر دم
قلم اس کا دُر افشاں و گہر تحریر
لیکن خود تہی داماں
شکستہ دل
خود اپنے فن سے اپنے آپ سے نالاں

یہاں دنیا کے غم بھولا ہوا
بسمل
ہر اک پیکر پہ سو سو جان سے قرباں

سعید اک کم نظر جذبات کا پتلا
مہرس
اور فقط جسموں کا سوداگر
جو اپنے ساتھیوں سے بھی چھپا کر ساتھ لایا تھا
کئی تحفے
ملمع کی ہوئیں انگوٹھیاں
جھوٹے نگوں کے ہار
دل آویزہ آویزے
کسی ماہر شکاری کی طرح

اپنی کمند و دام پر نازاں
ہر اک پر سحر طاری تھا
یہاں آذری کا رقص جاری تھا

ضیا حیرت میں گم
باسط ز خود رفتہ

سعید افسوں زدہ

میں بُت
کشن بی بی کے لب
کلیوں کی صورت نیم وا

اور ہم فقط
آواز کی خوشبو سے پاگل
لذّت معنی سے نامحرم
زبانِ یار کیلاشی و ما از ترف بیگانہ
(ہمارے میزباں نے ترجمانی کی.
کشن بی بی یہ کہتی ہے
"مرے محبوب تو اک دستۂ گُل ہے
کہ جواں راتوں کو میری چھاتیوں کے درمیان
خوشبو لٹاتا ہے
مری ہمجولیو!
بستی کے سارے نوجوانوں میں
مرا محبوب پیارا
جس طرح بن کے درختوں میں ہو نخلِ سیب استادہ

مرا محبوب
جیسے جھاڑیوں کے درمیان کوئی گل سوسن

مرا محبوب مجھ سے کل ملا تھا

اس نے مجھ سے خوب باتیں کیں

وہ کہتا تھا کہ اے میری پری

اے نازنین

اب تو مری بستی کو میرے ساتھ چل

برسات کا موسم چلا

بادل برس کر کھل چکے

انگور اور سیبوں کی مٹی جاگ اُٹھی

اے کوہساروں کی کبوتر

تو نہ جانے کن پہاڑوں کی دراڑوں میں چھپی ہے

آ مرے ہمراہ چل پیاری

بُتانِ آذری کا رقص جاری تھا

فضا پر سحر طاری تھا

ہر اِک کی آنکھ میں تل کی طرح

وہ کافرستاں کی قلوبطرہ

مگر ہم میں کوئی سیزر نہ انتونی

ضیا گوتم سہی

لیکن کمشنر، بی بی

وہ کافر جو ضیاء کو بھی نہ سونپی جائے ہے مجھ سے
نہ جانے کس طرح یہ شب ڈھلی

لیکن سحر دم
جب پرندوں کے چہکنے کی صدا آئی
کشن بی بی
سیہ ملبوس میں لپٹی
جبیں پر کوڑیوں کا تاج
گالوں پر گھنی زلفیں
کنیزوں کی طرح اپنے رفیقوں کو لئے
رخصت ہوئی ہم سے
بصد اندازِ استغنا و دارائی
تو ہم سارے تماشائی تھے پتھر
اور پتھر تھے تماشائی

غزل

تڑپ اٹھوں بھی تو ظالم تری دہائی نہ دوں
میں زخم زخم ہوں پھر تجھے دکھائی نہ دوں

ترے بدن میں دھڑکنے لگا ہوں دل کیطرح
یہ اور بات کہ اب بھی تجھے سنائی نہ دوں

خود اپنے آپ کو پرکھا تو یہ ندامت ہے
کہ اب کبھی اسے الزام بے وفائی نہ دوں

مری بقا ہی مری خواہشِ گناہ میں ہے
میں زندگی کو کبھی زہرِ پارسائی نہ دوں!

جو ٹھن گئی ہے تو یاری پہ حرف کیوں آئے
حریفِ جاں کو کبھی طعنِ آشنائی نہ دوں

مجھے بھی ڈھونڈ کبھی محوِ آئینہ داری
میں تیرا عکس ہوں لیکن تجھے دکھائی نہ دوں

یہ حوصلہ بھی بڑی بات ہے شکست کے بعد
کہ دوسروں کو تو الزامِ نارسائی نہ دوں

فرازؔ دولتِ دل ہے متاعِ محرومی
میں جامِ جم کے عوض کاسۂ گدائی نہ دوں

خواب جھوٹے خواب

خواب جھوٹے خواب میرے خواب تیرے خواب بھی
درد کی لذّت بھی دھوکا، قرب کا غم بھی فریب
بے قراری بھی نمائش خام یارائے شکیب
تشنگی کی آگ بھی باطل شرابِ ناب بھی

میں نے جس دریا کی وسعت دیکھ کر چاہا اُسے
وہ تو میری موجۂ غم سے بھی تھا پایاب تر
تُو بڑھی جن ساحلوں کی سمت مجھ کو دیکھ کر
تشنگی ان کی بجھا سکتی نہیں سیلاب بھی

واہموں میں مبتلا ہم آج تک سمجھا کئے
تیرا آئینہ بھی سورج میرے پتھر بھی گلاب
آؤ اب تسلیم کرلیں سب غلط باتیں کہیں
کاغذی ہیں پھول میرے تیرے دریا بھی سراب
خواب جھوٹے خواب میرے خواب تیرے خواب بھی

اس نگر میں زلف کا سایہ نہ دامن کی ہوا
اے غریبِ شہرِ ناپرساں ذرا آہستہ چل

آبلہ پا تجھ کو کس حسرت سے تکتے ہیں فراز
کچھ تو ظالم پاسِ ہمراہاں ذرا آہستہ چل

غزل

گلہ نہ کر دلِ ویراں کی ناسپاسی کا
ترا کرم ہی سبب بن گیا اداسی کا

ملول کر گئی ویران ساعتوں کی صدا
چمن میں جی نہ لگا جنگلوں کے باسی کا

بھرم کھلا ہے کہ جب اس سے ہم کلام ہوئے
ہمیں بھی زعم تھا پیارے سخن شناسی کا

شکستِ عہد کوئی ایسا سانحہ تو نہ تھا
تجھے بھی رنج ہوا بات اک ذرا سی کا

فرازؔ آج شکستہ پڑا ہوں بُت کیطرح
میں دیوتا تھا کبھی ایک دیوداسی کا

نذرِ نذرل[۱]

فن کار جو اپنے سحرِ فن سے
پتھر کو زبان بخشتا ہے
الفاظ کو ڈھال کر صدا میں
آواز کو جان بخشتا ہے
تاریخ کو اپنا خون دے کر
تہذیب کو شان بخشتا ہے

فن کار خموش ہو تو جابر
ظلمت کے نشان کھولتا ہے
ہر اہلِ نظر کو دستِ قاتل :
ہیرے کی انی پہ تولتا ہے
انسان بزورِ خاک و خوں میں
انساں کے حقوق رولتا ہے

۱ نذر الاسلام

فن کار اگر زباں نہ کھولے
ایثارِ گہر نصیب اُس کا
ورنہ ہم شہریار دشمن
ہر شیخِ حرم رقیب اُس کا
چاہے وہ فراز ہو کہ نذرل
بولے تو صلہ صلیب اُس کا

لہولہان مسیحا

زمین نے سانولے چہروں کی دھند پھیلا دی
جب آفتاب نے چاہا کہ اپنے شعلوں سے
سمندروں کی تہوں کے تمام لعل و گہر
محبتوں کے سلگتے گلاب راکھ کرے
زمیں کے سانولے چہرے نہ سرمئی بادل
بچا سکے ہیں مرے کاسنی شگوفوں کو
اُبل رہے ہیں چٹانوں کے ریگتے چشمے

ہر ایک سرو و صنوبر، چنار کی صورت
بھڑک اٹھا ہے یہاں تک کہ میرا سایہ بھی
مرے وجود کی دیوار میں سمٹ آیا!
وہ آفتاب کہ نصف النہار پہ ہے ابھی
مرے زمیں کے سُلگتے ہوئے شگوفوں کو
یقین غیر یقینی بہار پر ہے ابھی
پلٹ کے آئے نہ آئے اک آسرا ہے مگر
لہو لہان مسیحا کہ دار پر ہے ابھی

غزل

صحرا تو بوند کو بھی ترستا دکھائی دے
بادل سمندروں پہ برستا دکھائی دے

اس شہرِ غم کو دیکھ کے دل ڈوبنے لگا
اپنے پہ ہی سہی، کوئی ہنستا دکھائی دے

اے صدرِ بزم مے تری ساقی گری کی خیر
ہر دل لبانِ شیشہ شکستہ دکھائی دے

گر مے نہیں تو زہر ہی لاؤ کہ اس طرح
شاید کوئی نجات کا رستہ دکھائی دے

اے چشمِ یار تو بھی تو کچھ دل کا حال کھول
ہم کو تو یہ دیار نہ بستا دکھائی دے

جنسِ ہنر کا کوئی خریدار ہے فراز
ہیرا، کہ پتھروں سے بھی سستا دکھائی دے

غزل

یہ دل کا چور کہ اس کی ضرورتیں تھیں بہت
وگرنہ ترکِ تعلق کی صورتیں تھیں بہت

ملے تو ٹوٹ کے روئے نہ کھل کے باتیں کیں
کہ جیسے اب کے دلوں میں کدورتیں تھیں بہت

بھلا دیئے ہیں ترے غم نے دکھ زمانے کے
خدا نہیں تھا تو پتھر کی مورتیں تھیں بہت

دریدہ پیرہنوں کا خیال کیا آتا؟
امیرِ شہر کی اپنی ضرورتیں تھیں بہت

فراز دل کو نگاہوں سے اختلاف رہا
وگرنہ شہر میں ہم شکل صورتیں تھیں بہت

چلو اس بُت کو بھی رو لیں

چلو اس بُت کو بھی رو لیں
جسے سب نے کہا پتھر
مگر ہم نے خدا سمجھا
خدا سمجھا
کہ ہم نے پتھروں میں عمر کاٹی تھی
خدا سمجھا
کہ ہم نے معبدوں کی خاک چاٹی تھی
کہ پتھر تو کہیں دیوارِ زنداں
اور کہیں دہلیزِ مقتل تھے
کبھی سرمایۂ دامانِ خلقت
اور کبھی بختِ جنوں کیشاں
کبھی ان کا ہدف دکانِ شیشہ گر
کبھی صورت گرِ ہنگامۂ طفلاں
کبھی بے نور آنکھوں کے نشاں
بے اشک بے ارماں
کبھی لوحِ مزارِ جاں
نہ چارہ گر نہ اہلِ درد کے درماں

مگر وہ بُت
چراغِ بزمِ تنہائی

مجسم رنگ و رعنائی
فضا کی روشنی
آنکھوں کی بینائی
سکونِ جاں
وہ آنکھیں درد کی جھیلیں
وہ لب چاہت کے شعلوں سے بھرے مرجاں
وہ بُت انساں
مگر ہم نے وفورِ شوق میں
فرطِ عقیدت سے کہا یزداں
یہ ہم کافر
کہ دنیا کم نظر ناداں

سبھی لائے ہمارے سامنے اوراقِ پارینہ
کہ جن پر نقش تھے
اہلِ وفا کے عکسِ دیرینہ
شکستہ استخواں بے جان نابینا
جبیں سجدوں سے داغی

اور زخموں سے بھرا سینہ
اور ان کے بُت
مال سوزِ اہلِ دل سے بے پروا
سبھی خود بین و خود آرا
ہر اک محمل نشیں تنہا
مگر مصروفِ نظارہ

اور اب ہم بھی گرفتہ دل
نہ محرومی کہ سہہ پائیں
نہ بربادی چھپانے کے رہے قابل
وہ بُت مرمر کی سِل
اور اہلِ سجدہ کی جبیں گھائل
سبھی کی بات سچ
اور ہم ندامت کے عرق میں تر بتر
شرمندگی کے کرب سے بسمل

چلو اپنے جیسے نامرادوں سے منہیں بولیں
جو وہ کہتے ہیں وہ ہولیں
جبیں کے داغ آنکھوں کا لہو دھولیں
چلو اس بُت کو بھی رولیں

غزل

سائے کی طرح نہ خود سے رم کر
دیوار کو اپنا ہم قدم کر

اپنے ہی لئے بہا نہ دریا
اوروں کے لئے بھی آنکھ نم کر

تکمیلِ طلب نہیں ہے منزل
طے راہِ وفا قدم قدم کر

اے پچھلی رُتوں کو رونے والے
آنے والے دنوں کا غم کر

ممکن ہو تو تیشۂ ہنر سے
ہر پارۂ سنگ کو صنم کر

ہے چشم براہ ایک دنیا
پتھر کی طرح نہ بیٹھ جَم کر

یہ راہِ جنوں ہے اس میں پیارے
ممکن ہو تو احتیاط کم کر

اے قصرِ جہاں یہ تیرا معمار
تو ہاتھ فراز کے قلم کر

غزل

دولتِ درد کو دنیا سے چھپا کر رکھنا
آنکھ میں بوند نہ ہو دل میں سمندر رکھنا

کل گئے گذرے زمانوں کا خیال آئے گا
آج اتنا بھی نہ راتوں کو منّور رکھنا

اپنی آشفتہ مزاجی پہ ہنسی آتی ہے
دشمنی سنگ سے اور کانچ کا پیکر رکھنا

آس کب نہیں تھی دل کو ترے آجانے کی
پہ نہ ایسی کہ قدم گھر سے نہ باہر رکھنا

ذکر اس کا ہی سہی بزم میں بیٹھے ہو فراز
درد کیسا ہی اٹھے ہاتھ نہ دل پر رکھنا

خون بہا

اُجرتی قاتل کی صورت
بے حس و بے درد لمحوں کا خدا
آج پہلی بار جیسے قتل کر کے
سخت شرمندہ ہوا

بے گناہی کے لہو میں تر بتر
معصومیت کی راکھ میں لت پت
تڑپتی آرزو چیخی
کہ آخر کس عداوت کس ارادے
کس خطا کی یہ سزا

ایک منعم کی طرح
اجرتی قاتل نے میرے سامنے
بکھرے ہوئے اوراق پر
لفظوں کے کچھ لعل و گہر
یاقوت و مرجان ۔ رکھ دیئے
لو خون بہا
اور میں مقتول کے مجبور وارث کی طرح
چپ ہو گیا

نوحہ

اگرچہ مرگِ وفا بھی اک
سانحہ ہے لیکن یہ بے حسی
اس سے بڑھ کے جانکاہ ہے
کہ جب ہم خود اپنے ہاتھوں
سے اپنی چاہت کو نامرادی
کے راہگذاروں میں دفن
کر کے جدا ہوئے تو نہ
تیری پلکوں پہ کوئی آنسو
لرز رہا تھا نہ میرے ہونٹوں
پہ کوئی جاں سوز مرثیہ تھا

غزل

یاد آتا ہے تو کیوں اس سے گلہ ہوتا ہے
وہ جو اک شخص ہمیں بھول چکا ہوتا ہے

ہم ترے لطف سے نادم ہیں کہ اکثر اوقات
دل کسی اور کی باتوں سے دکھا ہوتا ہے

مل گئے ہو تو چلو رسم زمانہ ہی سہی
ورنہ اب پرسشِ احوال سے کیا ہوتا ہے

اسقدر زہر نہ تھا طنزِ حریفاں پہلے
اب تو کچھ خندۂ یاراں سے سوا ہوتا ہے

سادہ دل چارہ گروں کو نہیں معلوم فراز
بعض اوقات دلاسا بھی بلا ہوتا ہے

چاند اور میں

چاند سے میں نے کہا! اے مری راتوں کے رفیق
تو کہ سرگشتہ و تنہا تھا سدا میری طرح

اپنے سینے میں چھپائے ہوئے لاکھوں گھاؤ
تو دکھاوے کے لئے ہنستا رہا میری طرح

ضو فشاں حسن تیرا میرے ہنر کی صورت
اور مقدّر میں اندھیرے کی ردا میری طرح

وہی تقدیر تیری میری زمیں کی گردش
وہی افلاک کا نخچیرِ جفا میری طرح

تیرے منظر بھی ہیں ویراں میرے خوابوں جیسے
تیرے قدموں میں بھی زنجیرِ وفا میری طرح

وہی صحرائے شبِ زیست میں تنہا سفری
وہی ویرانۂ جاں دشت بلا میری طرح

آج کیوں میری رفاقت بھی گراں ہے تجھ کو
تو کبھی اتنا بھی افسردہ نہ تھا میری طرح

چاند نے مجھ سے کہا! اے میرے پاگل شاعر
تو کہ محرم ہے میرے قریۂ تنہائی کا

تجھ کو معلوم ہے جو زخم میری روح میں ہے
مجھ کو حاصل ہے شرف تیری شناسائی کا

موجزن ہے میرے اطراف میں اک بحر سکوت
اور چرچا ہے فضا میں تیری گویائی کا

آج کی شب میرے سینے پہ وہ قابیل اترا
جس کی گردن پہ دمکتا ہے لہو بھائی کا

میرے دامن میں نہ ہیرے ہیں نہ سونا چاندی
اور بجز اس کے نہیں شوق تمنائی کا

مجھ کو دکھ ہے کہ نہ لے جائیں یہ دنیا والے
میری دنیا ہے خزانہ میری تنہائی کا

غزل

وارفتگی میں دل کا چلن انتہا کا تھا
اب بت پرست ہے جو نہ قائل خدا کا تھا

مجھ کو خود اپنے آپ سے شرمندگی ہوئی
وہ اس طرح کہ تجھ پہ بھروسہ بلا کا تھا

وار اس قدر شدید تو دشمن ہی کر سکے
یہ چہرہ مگر ضرور کسی آشنا کا تھا

اب یہ کہ اپنی کشتِ تمنا کو رو دیئے
اب اس سے کیا گلہ کہ وہ بادل ہوا کا تھا

تو نے بچھڑ کے اپنے سر الزام لے لیا
ورنہ فراز کا تو یہ رونا سدا کا تھا

غزل

لگا کے زخم بدن پر قبائیں دیتا ہے
یہ شہرِ یار بھی کیا کیا سزائیں دیتا ہے

تمام شہر ہے مقتل اسی کے ہاتھوں سے
تمام شہر اُسی کو دعائیں دیتا ہے

کبھی تو ہم کو بھی بخشے وہ ابر کا ٹکڑا
جو آسمان کو نیلی ردائیں دیتا ہے

جدائیوں کے زمانے پھر آ گئے شاید
کہ دل ابھی سے کسی کو صدائیں دیتا ہے

صہبا

یوں بھی ہوتا ہے برسوں کے دو ہمسفر
اپنے خوابوں کی تعبیر سے بے خبر
اپنے عہدِ محبت کے نشے میں گُم
اپنی قسمت کی خوبی پہ نازاں، مگر
زندگی کے کسی موڑ پر کھو گئے
اور ایک دوسرے سے جدا ہو گئے

یوں بھی ہوتا ہے دو اجنبی راہرو
اپنی راہوں سے منزل سے ناآشنا
ایک کو دوسرے کی خبر تک نہیں
کوئی پیمانِ الفت نہ عہدِ وفا
اتفاقات سے اس طرح مل گئے
ساز بھی بج اُٹھے، پھول بھی کھل گئے

غزل

چلے تھے یار بڑے زعم میں ہوا کی طرح
پلٹ کے دیکھا تو بیٹھے ہیں نقشِ پا کی طرح

مجھے وفا کی طلب ہے مگر ہر اک سے نہیں
کوئی ملے مگر اس یارِ بے وفا کی طرح

مرے وجود کا صحرا ہے منتظر کب سے
کبھی تو آ جرسِ غنچہ کی صدا کی طرح

ٹھہر گئی ہے محبت کہاں کہ مدت سے
نہ ابتدا کی طرح نہ انتہا کی طرح

وہ اجنبی تھا تو کیوں مجھ سے پھیر کر آنکھیں
گذر گیا کسی دیرینہ آشنا کی طرح

فرازؔ کس کے ستم کا گلہ کریں کس سے
کہ بے نیاز ہوئی خلق بھی خدا کی طرح

اگر یہ سب کچھ نہیں..

ملے تو آج بھی ہیں لیکن
نہ میرے دل میں وہ تشنگی تھی

کہ تجھ سے مل کر کبھی نہ بچھڑوں
نہ آج تجھ میں وہ زندگی تھی

کہ جسم و جاں میں اُبال آئے
نہ خواب زاروں میں روشنی تھی

نہ میری آنکھیں چراغ کی لو
نہ تجھ میں ہی خود سپردگی تھی

نہ بات کرنے کی کوئی خواہش
نہ چپ ہی میں خوبصورتی تھی

مجسّموں کی طرح تھے دونوں
نہ دوستی تھی نہ دشمنی تھی

مجھے تو کچھ یوں لگا جیسے
وہ ساعتیں بھی گذر گئی ہیں

کہ جن کو ہم لازوال سمجھے
وہ خواہشیں بھی تو مر گئی ہیں

جو تیرے میرے لہو کی حدّت
کو آخرش برف کر گئی ہیں

محبتیں شوق کی چٹانوں
سے گھاٹیوں میں اتر گئی ہیں

وہ قربتیں وہ جدائیاں سب
غبار بن کر بکھر گئی ہیں

اگر یہ سب کچھ نہیں تو بتلا
وہ چاہتیں اب کدھر گئی ہیں